Version No.			

ROLL NUMBER						

0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0
1	1	1	1	1	1	1	1	1	1	1
2	2	2	2	2	2	2	2	2	2	2
3	3	3	3	3	3	3	3	3	3	3
4	4	4	4	4	4	4	4	4	4	4
5	5	5	5	5	5	5	5	5	5	5
6	6	6	6	6	6	6	6	6	6	6
7	7	7	7	7	7	7	7	7	7	7
8	8	8	8	8	8	8	8	8	8	8
9	9	9	9	9	9	9	9	9	9	9

FEDERAL BOARD OF INTERMEDIATE AND SECONDARY EDUCATION ISLAMABAD

Answer Sheet No.____________

Sign. of Candidate ___________

Sign. of Invigilator ___________

اردو(لازمی) برائے جماعت دہم (2nd Set Solution)

ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006ء)

حصہ اوّل (کل نمبر: 15، وقت: 20 منٹ)

حصہ اول لازمی ہے۔ اس کے جوابات اسی صفحہ پر دے کر ناظم مرکز کے حوالے کریں۔ کاٹ کر دوبارہ لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ **لیڈ پنسل کا استعمال ممنوع ہے۔**

سوال نمبر 1: ہر جزو کے سامنے دیے گئے درست دائرہ کو پر کریں۔

(1) "آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے" قواعد کی رو سے یہ شعر کس کی مثال ہے؟

(A) تلمیح ○ (B) کنایہ ○

(C) تشبیہ ○ (D) استعارا ○

(2) آدمی آدمی سے ملتا ہے دل مگر کم کسی سے ملتا ہے اس شعر میں قواعد کی رو سے "سے ملتا ہے" کو کیا کہیں گے؟

(A) قافیہ ○ (B) ردیف ○

(C) مجازِ مرسل ○ (D) محاورا ○

(3) غزل کے تمام اشعار ہوتے ہیں:

(A) ذو معنی ○ (B) جدا جدا معنوں کے حامل ○

(C) ایک ہی معنی کے حامل ○ (D) ایک ہی مرکزی خیال کے حامل ○

(4) "کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے دو گز زمیں نہ ملی کُوئے یار میں" اس شعر میں "دو گز زمیں" کو قواعد کی رو سے کیا کہیں گے؟

(A) محاورا ○ (B) تشبیہ ○

(C) کنایہ ○ (D) قافیہ ○

(5) جملہ، اسمیہ کے مبتدا اور خبر کو ہونا چاہیے؟

(A) اسم ○ (B) فعل ○

(C) حرف ○ (D) محاورا ○

(6) مسدس نظم کے ہر بند میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟

(A) تین ○ (B) چار ○

(C) پانچ ○ (D) چھے ○

(7) ایسی نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی جائے، اسے کیا کہتے ہیں؟

(A) منقبت ○ (B) مرثیہ ○

(C) نعت ○ (D) حمد ○

(8) تمہید، نفس مضمون، خاتمہ کس تحریر کے تین اہم حصے شمار کیے جاتے ہیں؟

(A) افسانہ ○ (B) مضمون ○

(C) ناول ○ (D) ڈراما ○

(9) ذیل میں علم بیان کی کس اصطلاح کے لغوی معنی پوشیدہ بات یا رمز و اشارہ کرنے کے ہیں؟

(A) کنایہ ○ (B) مجاز مرسل ○

(C) تشبیہ ○ (D) استعارا ○

(10) علم بیان کی کس اصطلاح میں لفظ اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے؟

(A) تشبیہ ○ (B) کنایہ ○

(C) استعارا ○ (D) روزمرہ ○

(11) آج کل سفید پوش مشکل سے گزر بسر کرتے ہیں۔ اس مثال میں کون سے لفظ کنایہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں؟

(A) آج کل ○ (B) سفید پوش ○

(C) مشکل سے ○ (D) گزر بسر کرتے ہیں ○

(12) ذیل میں سے کون سا مصرع صنعتِ تکرار کی مثال ہے؟

(A) رونا ہے اب ہنسی خوشی کا ○ (B) حیف ہے اس کی بادشاہی پر ○

(C) آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے ○ (D) شان رنگینی حسن چمن آرا بھی نہیں ○

(13) علم بیان کی کس اصطلاح میں کُل کہہ کر جزو یا جزو کہہ کر کُل مراد لی جاتی ہے؟

(A) مجاز مرسل ○ (B) کنایہ ○

(C) تشبیہ ○ (D) استعارا ○

(14) حرا نے سبق پڑھا۔ اس جملے میں "سبق" کو قواعد کی رو سے کیا کہیں گے؟

(A) فعل ○ (B) متعلق فاعل ○

(C) فاعل ○ (D) مفعول ○

(15) گلاب کا پھول خوبصورت ہے۔ قواعد کی رو سے اس جملے میں "خبر" کس لفظ کو کہیں گے؟

(A) گلاب ○ (B) کا ○

(C) ہے ○ (D) خوبصورت ○

جوابات:

(1)	A	(2)	B	(3)	B
(4)	C	(5)	A	(6)	D
(7)	D	(8)	B	(9)	A
(10)	C	(11)	B	(12)	C
(13)	A	(14)	D	(15)	D

فیڈرل بورڈ امتحان برائے جماعت دہم

اردو (لازمی) ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006)

وقت: 2:40 گھنٹے　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　کل نمبر: 60

نوٹ: حصہ دوم اور سوم میں دیے گئے سوالات کے جوابات علیحدہ سے مہیا کی گئی جوابی کاپی پر دیں۔ آپ کے جوابات صاف اور واضح ہونے چاہئیں۔

حصہ دوم (کل نمبر 30)

سوال نمبر 2: (الف) حصہ نثر:

عبارت کو غور سے پڑھیں اور نیچے دیے گئے سوالات میں سے سات کے جوابات اپنے الفاظ میں لکھیں: (7 x 2 = 14)

استنبول یا قسطنطنیہ کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے مساجد کا شہر کہا جاتا ہے۔ جہاں عثمانی عہد کا طرزِ تعمیر اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یوں تو پورے شہر میں تقریباً پانچ سو مساجد ہیں لیکن اسلامی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ سلیمانیہ مسجد ہے۔ دو تین سال پہلے مَیں ترکی حکومت کی دعوت پر آیا تھا۔ کویت میں قائم مرکز طبِ اسلامی کے زیرِ اہتمام استنبول میں تیسری طبِ اسلامی کانفرنس ہوئی تھی۔ ترکی کے میرے ایک دوست ڈاکٹر پروفیسر ڈوگواباچی ہیں۔ وہ ترکی کی تمام یونیورسٹیوں کے سربراہ ہیں۔ استنبول کانفرنس کا انھوں نے شان دار انتظام کیا تھا۔ ترکی کے وزیرِ اعظم جناب ترگت اوزال ہمارے میزبان تھے۔ ہم سب مندوبین سلیمانیہ مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے آئے تھے۔ تمام مندوبین کے لیے صف اول میں انتظام تھا۔ ہزارہا نمازی تھے۔ خطبۂ جمعہ آدھا عربی اور آدھا ترکی زبان میں تھا۔

سوالات:

i. اس عبارت کا مرکزی خیال لکھیں۔

جواب: استنبول کو مساجد کا شہر کہتے ہیں۔ ان مساجد کا طرز تعمیر عہدِ عثمانی کا نمائندہ ہے۔ پانچ سو مساجد کے اس شہر میں مصنف تیسری طبِ اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ جس کے میزبان ترکی کے وزیرِ اعظم ترگت اوزال اور منتظم ڈاکٹر پروفیسر ڈوگواباچی تھے۔ مصنف اور ساتھیوں نے وہیں نمازِ جمعہ ادا کی جس میں آدھا خطبہ عربی زبان میں اور آدھا ترکی زبان میں دیا گیا۔

ii. اس عبارت کا خلاصہ لکھیں۔

جواب: استنبول کو مساجد کا شہر کہا جاتا ہے جس میں موجود پانچ سو کے قریب مساجد عہدِ عثمانی کے طرزِ تعمیر کا مظہر ہیں۔ مصنف نے ڈاکٹر پروفیسر ڈوگواباچی کے زیرِ انتظام منعقد ہونے والی تیسری طبِ اسلامی کانفرنس میں شرکت کی تھی جس کی میزبانی ترک وزیرِ اعظم ترگت اوزال نے کی تھی، استنبول کی مسجد میں کانفرنس کے تمام مہمانوں کو نمازِ جمعہ کے لیے لے جایا گیا جہاں آدھا خطبہ ترکی زبان میں اور آدھا عربی زبان میں دیا گیا۔

iii. استنبول کی بہت بڑی خصوصیت کیا بتائی گئی ہے؟

جواب: استنبول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے مساجد کا شہر کہا جاتا ہے۔ جس میں عہدِ عثمانی کے طرزِ تعمیر کی نمائندہ پانچ سو مساجد ہیں۔

iv. سلیمانیہ مسجد کے متعلق کیا بتایا گیا ہے؟

جواب: سلیمانیہ مسجد اسلامی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کانفرنس کے تمام مندوبین نے یہاں نمازِ جمعہ ادا کی تھی۔

v. مصنف کس کی دعوت پر ترکی آیا تھا؟

جواب: مصنف ترکی حکومت کی دعوت پہ دو تین سال پہلے ترکی آیا تھا۔

vi. ڈاکٹر پروفیسر ڈوگواباچی کون تھے؟

جواب: ڈاکٹر پروفیسر ڈوگواباچی ترکی کی تمام یونیورسٹیوں کے سربراہ اور مصنف کے دوست تھے۔

vii. خطبۂ جمعہ کن دو زبانوں میں دیا گیا؟

جواب: سلیمانیہ مسجد میں خطبۂ جمعہ ترکی اور عربی زبان میں دیا گیا۔ یعنی آدھا ترکی زبان میں اور آدھا عربی زبان میں۔

viii. استنبول میں طبِ اسلامی کانفرنس کون سا ادارہ کرا رہا تھا؟

جواب: استنبول میں طبِ اسلامی کانفرنس، کویت میں قائم مرکز طبِ اسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔

ix. استنبول شہر میں کتنی مساجد ہیں؟

جواب: استنبول شہر میں تقریباً پانچ سو مساجد ہیں۔

(ب) حصہ شعر:

درج ذیل اشعار کو غور سے پڑھیں اور آخر میں دیے گئے سوالات میں پانچ کے جوابات لکھیں: **(5 x 2 = 10)**

i.	یہ گرم و سرد، خشک و تر، اُجالا اور تاریکی	نظر آتی ہے سب میں شان اُسی کی ذاتِ باری کی
ii.	محبت صلح بھی، پیکار بھی ہے	یہ شاخِ گل بھی ہے، تلوار بھی ہے
iii.	عبادت ہے سراپا جذبہء تعمیر آزادی	شہادت مستقل اک سرخیِ تحریر آزادی
iv.	اب انساں کو انساں کا عرفان ہو گا	یقیں ہو گیا، اعتبار آ گیا ہے
v.	کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں	ہوش جب بے خودی سے ملتا ہے

<u>سوالات:</u>

i. پہلے شعر کا مرکزی خیال لکھیں۔

جواب: دنیا کی ہر شے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت جھلکتی ہے۔ فطرت کے تمام رنگ، ذاتِ باری کی شان کی گواہی دیتے ہیں۔

ii. شاعر نے محبت کے کیا وصف بیان کیے ہیں؟

جواب: محبت صلح بھی ہے۔ پیکار بھی ہے۔ شاخِ گل اور تلوار بھی ہے۔

iii. جذبہء تعمیر آزادی کو کس طرح عبادت قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: آزادی کے حصول میں گزارا جانے والا ہر لمحہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ آزادی ان لوگوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہوتا ہے جو اپنی جانیں قربان کر کے ملک و قوم کو غلامی سے نجات دلاتے ہیں۔

iv. انسان کو انسان کا عرفان ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب: انسان کو انسان کا عرفان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب انسان، انسان پر ظلم نہیں کرے گا۔ انسان، انسان کا خیال رکھے گا۔ دنیا میں اخوت، امن اور بھائی چارے کی فضا قائم ہو گی۔

v. کاروبارِ جہاں کس طرح سنورتے ہیں؟

جواب: جب انسان جوش و جذبے اور عقل سے کام لیتا ہے تو زندگی میں ہر قدم پر کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انسان کے لیے کاروبارِ زندگی سنور جاتے ہیں۔

vi. ہوش اور بے خودی کے ملنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ہوش سے مراد عقل اور سمجھ بوجھ ہے جبکہ بے خودی سے مراد جوش و جذبہ ہے۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جوش و جذبے کے ساتھ ساتھ عقل اور معاملہ فہمی کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

(ج) حصہ قواعد:

مندرجہ ذیل میں سے تین اجزا کے جوابات لکھیں۔ **(3 x 2 = 6)**

i. مرثیہ کس نظم کو کہا جاتا ہے؟

جواب: **مرثیہ:**

مرثیہ عربی زبان کا لفظ "رثا" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مُردے کو رونے اور اُس کی خوبیاں بیان کرنے کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ صنف زیادہ تر واقعہ کربلا اور شہدائے کربلا کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ مرثیہ عام طور پر نو اجزا پر مشتمل ہوتا ہے: تمہید، چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور دعا

ii. نظم اور غزل کا فرق بتائیے۔

جواب: **نظم اور غزل میں فرق:**

نظم اگرچہ متعدد اشعار پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود پوری نظم ایک ہی موضوع، مضمون یا مرکزی خیال کی حامل ہوتی ہے۔

جب کہ غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے یعنی ہر شعر کا جدا جدا مفہوم، موضوع، مضمون یا مرکزی خیال ہوتا ہے۔

iii. "انسان کی زندگی چار دن کی ہے۔" اس مثال میں علم بیان کی کون سی اصطلاح استعمال کی گئی ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب: اس مثال میں مجاز مرسل کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے کیونکہ چار دن کہہ کر پوری زندگی مراد لی گئی ہے۔

iv. سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں — لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

اس شعر میں موجود قافیہ ردیف کی نشاندہی کریں۔

جواب: اس شعر میں "تمنا، بھروسا" قافیہ جبکہ "بھی نہیں" ردیف ہے۔

حصہ سوم (کل نمبر 30)

سوال نمبر 3: مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک پیراگراف کی تشریح کریں: (5)

الف۔ افوہ! بھئی بہت سن لیں تمہاری باتیں۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔ میرے گھر رہنا ہے تو جیسا میں کہوں گی وہی کرنا ہو گا ورنہ۔۔۔۔۔۔"۔ دروازہ بند ہوتے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ لرز رہے تھے، غصے سے یا شاید سردی سے۔ کھڑکی کے شیشوں پر سے پرانی ساڑھی سے بنا ہوا پردہ بھی ہٹا ہوا تھا۔ پھر بھی کُہر کے مارے ہوئے سورج کی روشنی میں کمرا اندھیرا لگ رہا تھا۔

جواب: **تشریح:**

اس پیراگراف میں بنیادی طور پر ایک ایسی خاتون کی بیماری کے متعلق بتایا جارہا ہے جو تپ دق یعنی ٹی بی جیسی موذی بیماری کا شکار ہو کر مزاجاً چڑچڑی ہو جاتی ہے یہ افسانہ جس زمانے کا ہے اس وقت تپ دق کے شکار مریض کا علاج ممکن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گھر بھر اس سے ہمدردی اور دیکھ بھال کا رویہ اختیار کرنے کی بجائے قطع تعلق کر لیتا تھا۔ ایک طرف مرض کی تکلیف بھی مریض کو برداشت کرنی پڑتی تو دوسری طرف اپنوں کی بے مروتی بھی سہنی پڑتی۔

خاتون شادی سے قبل بالکل صحت مند تھی مگر گھریلو معاشی حالات، تنگ دستی وغیرہ نے اسے اس مرض کا شکار کر دیا تھا۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں مشرقی عورت کے جذبۂ ایثار و قربانی کو موضوع بنایا ہے کہ اس کی ہر خوشی و مسرت کا محور و مرکز صرف اور صرف اس کا شوہر، گھر اور بچے ہوتے ہیں۔ اپنا آرام، راحت اور خوشیاں وہ گھر پر قربان کر کے ہی خوشی محسوس کرتی ہے۔

افسانہ نگار ایک اور اہم پہلو پر بھی روشنی ڈالتی ہیں کہ مرد اور عورت معاشرتی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ایک فرد متاثر ہو جائے تو دوسرے کو اس کا ہر صورت میں ساتھ دینا چاہیے تا کہ گھر اور بچے متاثر نہ ہوں۔ جس طرح ایک خاتون زندگی کی گرمی سردی اور دھوپ چھاؤں میں گھر بھر کا خیال اور دھیان رکھتی ہے۔ شوہر، بچے بیمار پڑ جائیں تو ان کی خدمت میں اپنی نیند تک خود پر حرام کر لیتی ہے اسی طرح اگر خاتون خانہ پر اگر کوئی مشکل کی گھڑی، امتحان یا آزمائش آجائے تو بیماری ہاری کے ان لمحات میں سب گھر والوں کو مل کر اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

یہاں خاتون کو معلوم ہے کہ وہ تپ دق کی مریضہ ہے اور بخشو میاں، جو ان کا پرانا ملازم ہے، اسے ڈانٹ رہی ہے۔ اپنے مرض کی وجہ سے اسے کمزوری اور سردی محسوس ہوتی ہے لیکن مزاج میں تندی آچکی ہے اس لیے ملازم پر ناراضی کا اظہار کر رہی ہے لیکن اپنے ہاتھ لرز رہے ہوتے ہیں۔ کھڑکی کے شیشوں پر سے پرانی ساڑھی کا پردہ بھی ہٹا ہوا ہے۔ یعنی افسانہ نگار نے یہاں غربت اور افلاس کی تصویر پیش کی ہے۔ بعد میں آنے والے واقعات میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ خاتون کو مرض لاحق ہوتا ہے تو گھریلو حالات کی وجہ سے۔

ب۔ صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ پروفیسر مرزا محمد سعید کا آج سوئم ہے۔ خاموش زندگی! خاموش موت! مرزا صاحب کی علالتِ مزاج یا مرض الموت کی اطلاع اس سے پہلے کہیں سے نہیں ملی۔ حد یہ کہ پرسوں وہ رحلت فرما گئے اور ان کے سینکڑوں دوستوں اور قدردانوں کو اس سانحہء ارتحال کی خبر تک نہ ہوئی۔ افسوس اتنا بڑا صاحب کمال ہم میں سے اُٹھ جائے اور اس کی سناؤنی ہم تک نہ پہنچے۔

جواب: تشریح:

اہلِ کمال کی ناقدری تو اہلِ دنیا کا وطیرہ رہا ہے۔ ہمارا معاشرہ اور ہم چڑھتے سورج ہی کے پجاری ہوتے ہیں۔ ہمارے درمیان کتنی عظیم ہستیاں موجود ہوتی ہیں لیکن ہم ان کی قدر نہیں کرتے اور جب قدرت دیکھتی ہے کہ ہم بزرگوں ہستیوں کا کفرانِ نعمت کر رہے ہیں تو پھر یہ نعمتیں ہم سے لے لی جاتی ہیں اور پھر ہم کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کو بھی اگرچہ پروفیسر مرزا محمد سعید سے بہت زیادہ عقیدت تھی لیکن ان کی اپنی طبیعت کی لاپروائی تھی کہ انھیں بھی اس عظیم استاد کی فوتگی کی خبر تک نہ ہوئی بلکہ انھیں بھی اخبار ہی کے ذریعے معلوم ہوا۔

بنیادی طور پر خاکہ نگار یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ہمیں اپنے بزرگوں اور بزرگ ہستیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کے وجود کو غنیمت اور نعمت سمجھ کر قدر کرنی چاہیے۔ شاہد احمد دہلوی تو پروفیسر مرزا محمد سعید کی بلند مرتبہ شخصیت سے آگاہ تھے ہی۔ ان کے علمی مقام و مرتبہ سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کی طبیعت اور عادات و اطوار بھی دیکھ رکھے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی وفات پر انھیں شدید صدمہ پہنچا۔

مرزا محمد سعید تدریس و تعلم کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی زبان و ادب کی تدریس میں مصروفِ عمل رہے۔ ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور بے مثال استاد تھے جنھوں نے ساری عمر خودداری کی حالت میں گزار دی۔ حرص اور لالچ انھیں چھو کر بھی نہ گزری۔ شہرت اور دولت کمانے کی قابلیت صلاحیت بھی تھی اور مواقع بھی میسر تھے لیکن مرزا محمد سعید نے کبھی اس کی پرواہ کی نہ کبھی اس کی۔ ایک عالِم سے ایک عالَم اکتسابِ فیض کیا کرتا ہے۔ یہی صاحبِ علم جب دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے فیض کے چشمے بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ سینکڑوں تشنگانِ علم ان کے فیوضاتِ علمی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علم و ادب سے وابستہ لوگوں کے ایک وسیع حلقے کو مرزا محمد سعید جیسے استاد الاساتذہ کے دنیا سے رخصت ہونے پر شدید صدمہ پہنچا۔

بلاشبہ ہمیں اپنے گریبان میں جھانکتے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں شعوری یا لاشعوری طور پر ہم کسی شخصیت یا بزرگ کو نظر انداز تو نہیں کر رہے۔ اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں سے غفلت کا مظاہرہ تو نہیں کر رہے؟ ہمیں اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنا ہوگی کیونکہ وقت گزر جائے تو پھر ہاتھ نہیں آیا کرتا۔

سوال نمبر4: مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک نظمیہ جزو کی تشریح کیجیے: (5)

الف۔ تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور — دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے — اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

جواب: تشریح:

شاعر نے ایک معصوم بچی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ جس نے میدانِ جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ کیل کانٹے سے لیس دشمن کے خلاف برسرِپیکار فوجوں کی خدمت کے لیے تلوار اور ڈھال کے بغیر میدانِ جنگ میں اترنے والی اس لڑکی نے آنے والی نسلوں کے لیے یہ بات ثابت کی کہ:

ے کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

فاطمہ بنتِ عبداللہ کے جذبۂ شہادت نے مسلمان قوم اور بالخصوص مسلمان نوجوانوں میں حوصلے اور ہمت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی تھی جو اس بات کی عکاس تھی کہ ابھی اس قوم سے جذبۂ شوقِ شہادت کم نہیں ہوا۔ نوجوان آج بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ:

ے شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے — لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکواۃ ہے

فاطمہ بنتِ عبداللہ ایسے ہی نوجوانوں کی نمائندہ لڑکی تھی جس نے اپنی قوم کے روشن اور تابناک مستقبل کا تعین کرنا تھا۔ کسی بھی قوم کے نوجوان اس کی تعمیر و ترقی اور تحفظ و سلامتی کے حوالے سے ہر اول دستے کی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ وہ قوم مردہ اور زوال پذیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے نوجوانوں میں اپنی قوم کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے کی ہمت جواں ہو۔ فاطمہ بنتِ عبداللہ نے قربانی کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ تاریخ انسانی اس کی مثال دینے سے قاصر ہے۔ فاطمہ بنتِ عبداللہ اسی جذبے سے سرشار تھی جس کا اشارہ شاعرِ مشرق نے اس شعر میں کیا تھا:

ے شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

دو نیم اِن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ جن کی ہیبت سے رائی

فاطمہ بنتِ عبداللہ کی شہادت رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کی قربانی سے مسلم قوم میں ایک نیا جذبہ کروٹ لے گا۔ اقبال نے اس معصوم بچی کی شہادت کو پوری مسلم اُمہ کے لیے نیک شگون قرار دیا تھا۔

ب۔ الجزائر کے مسلمانو! خبر بھی ہے تمھیں — شمع آزادی کے پروانو! خبر بھی ہے تمھیں
چین آتا ہے کسی طور نہ آرام ہمیں — فکر رہی ہے تمہاری سحر و شام ہمیں

جواب: **تشریح:**

احسان دانش نے اپنی معروف نظم "آزادی" میں کہا تھا کہ:

ے عبادت ہے سراپا جذبۂ تعمیر آزادی — شہادت مستقل ہے اک سرخی تحریر آزادی

یعنی جو لوگ اپنی قوم اور ملک کی خاطر سر بکف رہتے ہیں پوری قوم انھیں سر آنکھوں پہ بٹھاتی ہے۔ ملک و قوم کی آزادی، سلامتی اور تحفظ میں گزرا ایک ایک لمحہ عظمت اور خیر و برکت کا حامل ہوتا ہے۔ شاعر نے اپنی نظم کے اس بند میں ان حریت پسندوں اور آزادی کے متوالوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے جو الجزائر میں استعماری طاقت کے خلاف سینہ سپر تھے۔ مسلم قوم کی یہی خوبی تو ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنے جواں مردوں کے ساتھ یکجہتی اور یگانگت کا اظہار کرتا ہے کیونکہ:

ے اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں — تو ہندوستاں کا ہر پیر و جواں بے تاب ہو جائے

شاعر نے الجزائر کے مسلمانوں سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم تو میدانِ جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہو، ہم اگرچہ تمھارے ہم قدم نہیں ہو سکتے لیکن تم سے الگ بھی نہیں ہیں۔ تمھاری کامیابی کے لیے ہر وقت بے چین اور بے تاب رہتے ہیں۔ ہمارے ہاتھ سر بلند رہتے ہیں، ہمارے لب ہلتے ہیں تو فقط یہ دعا لیے ہوئے کہ خالق کائنات تمھاری کوششوں کو کامیابی سے ہم کنار کر دے۔ ہم تمھارے لیے بے چین رہتے ہیں، تمھارے لیے راتوں کی نیند اُچاٹ ہو گئی ہے۔ تم میدانِ جنگ میں آزادی کے لیے جو کوششیں کر رہے ہو اس میں تم تنہا نہیں ہو۔ شاعر بنیادی طور پر اس شعر کی عکاسی کر رہا ہے کہ:

ے ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

شمالی افریقہ میں واقع الجزائر صدیوں سے مسلم تہذیب و ثقافت کا مرکز اور گہوارہ رہا ہے۔ 1962ء میں الجزائر نے فرانس سے آزادی حاصل کی تھی۔

سوال نمبر5: مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک غزلیہ جزو کی تشریح کیجیے: (5)

الف۔ بھول جاتا ہوں مَیں ستم اس کے — وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے
آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا — رنگ، تیری ہنسی سے ملتا ہے

جواب: **شعر نمبر1 کی تشریح:**

شاعر اپنے محبوب کے ہر ظلم، بے وفائی، کج روی اور وعدہ خلافی کو معاف کرنے پر تیار ہو جاتا ہے جب محبوب انتہائی سادگی کے عالم میں اس سے ملتا ہے گویا کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہزار اختلافات کے باوجود جب محبوب ہنس کر، مسکرا کر شاعر کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کی چارہ گری کرتا ہے، اس کا حال احوال پوچھتا ہے تو شاعر کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔ محبوب کے ایک ہی بار دیکھنے یا ملنے سے عاشق یا شاعر کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔ خواہشوں اور آرزوؤں کے کملائے ہوئے پودے ایک بار پھر سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔

اردو غزل کا یہ عمومی موضوع رہا ہے کہ شاعر یا عاشق اپنے محبوب کے ہر ظلم اور ناروا سلوک کو خاموشی سے سہتا ہے اور کسی قسم کا گلہ شکوہ نہیں کرتا:

ے ہر زخم جگر، داورِ محشر سے ہمارا — انصاف طلب ہے تیری بیدادگری کا

یعنی ناحق ناروا سلوک پر عاشق یا شاعر نے کسی قسم کا احتجاج کرنا یا حرفِ شکایت زبان پر لانا، اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ برداشت اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ محض اس امید اور آس پر کہ کبھی تو ان کی وفا رنگ لائے گی اور محبوب کو ان کی وفا کا یقین آ جائے گا۔ الغرض شاعر کوشش کے باوجود اسے نہ بھلا سکتا ہے اور نہ ہی دل سے نکال سکتا ہے:

ے ٹھانی تھی دل میں کہ اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

مطلب یہ کہ محبوب کی اداؤں میں اس قدر سادہ لوحی اور معصومیت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے آتے ہی اس کا ہر ستم، بے وفائی اور گلے شکوے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔اور شاعر یا عاشق کو اپنے محبوب کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

شعر نمبر2کی تشریح:

اس شعر میں شاعر نے پھولوں کی خوبصورتی اور نزاکت کو محبوب کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح کی شگفتگی، تروتازگی اور زندگی، پھولوں کی رنگت ورعنائی میں پنہاں ہوتی ہے ویسی ہی خوبیاں محبوب کی شوخیوں اور مسکراہٹ میں ہوتی ہیں۔جس طرح کلیاں اور غنچے چٹک کر پھول بنتے ہیں تو اس عمل میں بڑی نازک اور دل کو موہ لینے والی صدا ہوتی ہے لیکن یہ آواز اتنی مدہم اور نازک ہوتی ہے کہ توجہ کے بغیر سنی نہیں جاسکتی۔اسی لیے تو علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

؎ خدا!اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ وگل سے کلام پیدا کر

شاعر کو محبوب کی مسکراہٹ اور ہنسی کا انداز بھی پھولوں کے کھلنے اور کلیوں کے چٹکنے جیسا ہی محسوس ہوتا ہے۔جس طرح پھولوں کو دیکھ کر اس کی طبیعت میں تروتازگی آجاتی ہے وہ ہشاش بشاش ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح شاعر اپنے محبوب کو دیکھ کر خوش وخرم ہو جاتا ہے۔احمد فراز کے بقول:

؎ سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں — یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

خواجہ حیدر علی آتش نے کہا تھا:

؎ دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے — کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

ب۔ حیران ہیں، لب بستہ ہیں، دلگیر ہیں غنچے — خوشبو کی زبانی تیرا پیغام ہی آئے

لمحاتِ مسرت ہیں تصور سے گریزاں — یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

جواب: شعر نمبر1کی تشریح:

کسی شاعر نے کہا تھا:

؎ میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں — کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شاعر نے اس شعر میں غنچوں یعنی پھولوں کو حیران و پریشان قرار دیا ہے کہ یہ کسی کے منتظر ہیں۔ان کی تمام تر رنگت ورعنائی کسی کی مرہونِ منت ہے۔اور جب تک وہ چمن میں قدم نہیں رکھتا پھولوں پر نکھار کیسے آسکتا ہے۔طریقہ اور سلیقہ یہ ہے کہ جس کے دم سے محفل کی رونق ہوتی ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو ہر طرح کی تروتازگی، چہل پہل اور شگفتگی کے رنگ ماند اور پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

؎ بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصرؔ — ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

جس کے ہونے سے رعنائیاں ہوتی ہیں، رُتیں سرسبز وشاداب رہتی ہیں، ہر سمت پھولوں کی بہاریں ہوتی ہیں اگر وہ ہی موجود نہ ہو تو پھر ہر طرح کی گہما گہمی بے کار ہو جاتی ہے۔

؎ بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی — اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

اس لیے شاعر کہتے ہیں کہ کسی طرف سے تیرے آنے کی خبر تو ملے تاکہ خزاں پھر سے بہار میں بدل جائے، مرجھائے ہوئے پھول کھِل جائیں۔

شعر نمبر2کی تشریح:

گزرا وقت انسان کے لیے ہمیشہ کرب اور اذیت ہی کا باعث رہا ہے۔ماضی کا وقت اگر آسودہ اور خوشی ومسرت سے بھرپور تھا تو اس کی محرومی کا احساس تڑپاتا ہے۔اگر گزرے وقت میں انسان مصیبت وابتلا کا شکار رہا ہو تو حالات کی تلخیاں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔انسان چاہ کر بھی ماضی سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ماضی انسان کی زندگی کا اٹوٹ انگ ہوتا ہے:

؎ یاد ماضی عذاب ہے یارب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

انسان کی سرشت ہے کہ اس کی توجہ اور نظر ہمیشہ اس بات پر ہوتی ہے کہ اسے کیا نہیں ملا۔حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہونی چاہیے بلکہ ہوتی ہے۔یعنی انسان کی بہت سی خواہشات پوری ہوتی ہیں اور بہت سی تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں۔لیکن انسان نوحہ کناں رہتا ہے اس بات پر کہ کون سی آرزوئیں پوری نہ ہوسکیں:

؎ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

شاعر بھی یہی کہتے ہیں کہ میرے تصور میں بہت ہی کم ایسے لمحے یاد کی صورت میں محفوظ ہیں جو خوشی اور مسرت سے بھرپور ہوں۔ مجھے تو جب بھی یاد آئے، مصیبتیں اور پریشانیاں ہی یاد آئیں جنھوں نے زندگی میں کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔

سوال نمبر6: "احسان کا بدلہ احسان" کہانی لکھیں۔ (5)

جواب: کہانی: ایک فاختہ اور چیونٹی

زندگی ایک سفر ہے اور اس دائروی سفر میں آئے دن ایسے ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ جن سے سبق حاصل کر کے ہم اپنی زندگی کو باسہولت بنا سکتے ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے راہوں میں مشعلیں بھی جلا سکتے ہیں۔ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے جس میں ہمارا ہر عمل لوٹ کر ہمارے پاس ضرور آتا ہے۔ یہی بات ایک کہانی سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ کسی ہرے بھرے، سرسبز و شاداب جنگل میں چرند، پرند، درند نہایت پُرامن زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا؛ اس جنگل کی سنہری روایات میں سے ایک تھا۔ اسی جنگل میں ایک تناور درخت کی گھنی شاخوں پر، فاختہ خوشی اور امن کے گیت گایا کرتی تھی۔ درخت کے نیچے ایک محفوظ جگہ پر چیونٹی نے بھی اپنا ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ بقائے باہمی کے اُصولوں کے مطابق، دونوں میں گہری دوستی تھی۔ ایک دفعہ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ چیونٹی، دریا کے کنارے خراماں خراماں چلی جا رہی تھی۔ موسم نہایت دل کش تھا۔ جنگل کے نباتات و حیوانات فرحاں و شاداں تھے۔ چیونٹی مستی میں دریا کے کنارے موسم کا لطف اٹھا رہی تھی کہ اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور اسے اڑا کر دریا میں لے گیا۔ چیونٹی کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے لیکن دریا کے کنارے ایک درخت پر بیٹھی فاختہ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ چیونٹی کی بے بسی کو دیکھتے ہوئے، فاختہ اُڑی اور درخت کا ایک بڑا سا پتّا چیونٹی کے پاس گرا دیا۔ چیونٹی فوراً درخت کے پتے پر چڑھ گئی اور پانی کی لہروں کے ساتھ بہتے ہوئے صحیح سلامت، کنارے جا لگی۔ یوں فاختہ کی رحم دلی سے چیونٹی کی جان بچ گئی اور اس نے اس نیکی پر فاختہ کا شکریہ بھی ادا کیا۔

ابھی چند روز بھی نہ گزرے ہوں گے کہ جنگل میں ایک آدمی شکار کے لیے آ گیا۔ شکاری کے ہاتھ میں بندوق تھی جس سے وہ مختلف پرندوں کا شکار کر رہا تھا۔ ظالم شکاری اپنے شکار کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ اُدھر فاختہ بے دھیانی میں بیٹھی امن کے سریلے نغمے بکھیرے جا رہی تھی کہ شکاری کی نظر اُس پر جا پڑی اور اُس کو شکار کرنے کی غرض سے نشانہ باندھنے کی تیاری کرنے لگا۔ اتنے میں چیونٹی کی نظری شکاری پر پڑ گئی۔ وہ بھاگ کر شکاری کی طرف آئی۔ قریب تھا کہ فاختہ کو شکاری نشانہ بناتا، چیونٹی نے اس زور سے اُسے کاٹا کہ شکاری بلبلا اُٹھا اور اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ فاختہ بھی بندوق کی آواز پر چونکی۔ اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی۔ فوراً اُڑ کر اپنی جان بچاتے ہوئے اُس کی نظر اُسی چیونٹی پر پڑی جسے اُس نے دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ فاختہ نے بھی جان بچانے پر چیونٹی کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو چیونٹی بولی، شکریہ کس بات کا؟ تم نے میری جان بچائی میں نے تمھیں شکار ہونے سے بچا لیا۔ حساب برابر ہو گیا۔

نتیجہ: احسان کا بدلہ احسان ہی ہوتا ہے۔

سوال نمبر7: اشارات کی مدد سے مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک موضوع پر پانچ سو سے چھ سو الفاظ پر مشتمل مضمون لکھیں۔ (10)

الف۔ برسات کا موسم:

i. پاکستان میں موسموں کی تعداد۔ برسات کا موسم
ii. ٹھنڈی ہوا، بادل، گرج چمک، بارش کا جانداروں پر اثر
iii. گھروں میں پکوان، گیت، خوشی، جھولوں کا اہتمام، بارش میں نہانا
iv. چرند پرند اور دوسری مخلوق خدا کا اظہارِ تشکر
v. بارش کے بعد سیلاب، گندگی، کیچڑ، بیماریاں

جواب: مضمون: برسات کا موسم:

ے
بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑے ہیں پانی ہر جا، جل تھل بنا رہے ہیں گلزار بھیگتے ہیں، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

جو بیماری کی صعوبت برداشت نہیں کرتا، وہ صحت کی لذت بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ جس نے اندھیری راتوں کا نظارہ نہ کیا ہو وہ کیا جانے، چاندنی رات کی بہار کیسی ہوتی ہے؟ سُکھ کی لذت سے وہی واقف ہے جس نے زندگی میں سوگوار دن بھی دیکھے ہوں۔ جس نے گرمی اور حبس کی شدت نہ دیکھی ہو۔ وہ برسات کی بہاروں سے وہ شادمانی حاصل نہیں کر سکتا جو ایک طویل صحرائی سفر کے بعد نخلستان میں محسوس کرتا ہے۔

اس سال مئی کے اوائل میں ہی گرمی کے تیور خراب نظر آئے۔ جوں جوں ہم موسم گرما کے وقت صحرا میں آگے بڑھتے گئے۔ سورج کی تمازت جان لیوا ہوتی گئی۔ ہر طرف ہو کا عالم، دن کے وقت گلیاں سنسان اور سڑکیں ویران، بازاروں میں حسرت و یاس اور ویرانوں میں ٹنڈ منڈ اور لاوارث ماحول "انیس" نے کربلا میں گرمی کی جس شدت کا اظہار کیا تھا وہ ہمیں یہاں بے حال کر رہی تھی۔

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

عہدِ قدیم میں لوگ بجلی کی رحمتوں سے نا آشنا تھے۔ ان میں تاب استقامت اور حوصلہ تھا۔ وہ گرمی کا مقابلہ کورے کورے مٹکوں اور صراحی کے ٹھنڈے پانی سے کرتے تھے۔ چکن، شربتی ململ یا ڈوریا کے ہلکے ہلکے کپڑے پہن کر سکون سے وقت گزارتے تھے۔ سلیم شاہی جوتے پہن کر سڑکوں پر اتراتے پھرتے تھے۔ امراء خسخانوں میں پڑے فراشی، پنکھوں کا استعمال، خس کی ٹٹیوں پر پانی چھڑکتے، وقت گزارتے، بازاروں میں دوپہر کو بھی رونق ہوتی۔ فالودہ جس میں تخم ریحان ڈال ڈال کر عین دوپہر کے وقت پیتے تھے۔

لیکن اس جدید عہد میں جس میں ہمارے تمام سامان اور گرمی سے بچنے کے لیے سہارے بجلی کے کندھوں پر سوار ہیں۔ جوں جوں گرمی بڑھتی گئی۔ دریاؤں میں پانی کم ہوا، تو بجلی کی لوڈشیڈنگ بھی شروع ہو گئی۔ ہم نئی نسل کے لوگ بلبلا اُٹھے۔ گرمی میں زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ تارکول کی سڑکیں آگ کا دریا بن گئیں۔ سیمنٹ کے در و دیوار چھتیں، آتش برسانے لگے۔ فرج اور بجلی کے پنکھے منہ چڑانے لگے۔ پھر رات کی گرم ترین تاریکی کے وار سہہ کر سورۃ الرحمٰن کی اس آیت کی طرف خیال چلا جاتا۔

"اے جنوں اور انسانوں کے گروہو! اگر تم چاہو کہ زمین اور آسمان کے قلابوں سے بھاگ جاؤ، تم ایسا نہیں کر سکتے۔ آگ کے شعلے اور دھواں تم پر پھینک دیئے جائیں گے اور آسمان سرخ چمڑے کی طرح سرخ ہو جائے گا۔"

غرض ہم اس گرمی کی شدت میں بھاگ نہ سکتے تھے نہ اسے سہہ سکتے تھے۔ اس عہد کے انسان کی یہ مجبوری تاریخ عالم میں ہمیشہ قابل توجہ رہے گی۔

عین ساون سے دو دن قبل سویرے جب حبس نے دوپہر کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی، مشرق سے سیاہ بادل اُٹھے، بچے اور بوڑھے مشرق کی سمت ایسے دیکھنے لگے جیسے عید کا چاند مشرق سے نکلنے والا ہو۔ ان سست رو سیاہ بادلوں کے پیچھے سے گھنگور گھٹائیں اُمڈتی ہوئی سیاہ بادلوں کی پیچھے چھوڑتی ہوئی ایسے آگے بڑھ رہی تھیں جیسے تیز رفتار بس کسی دوسری سست رو بس کو پیچھے چھوڑ کر دندناتی آگے بڑھ رہی ہو۔ بچوں نے بارش کی آمد سے پہلے ہی لنگوٹ کس لیے اور برسات کے گیت گانے شروع کر دیئے۔ گھنگور گھٹاؤں کا پہلا ریلا آیا اور اپنے موٹے موٹے بارش کے قطروں سے زمین کو نقارے کی طرح بجاتا ہوا گزر گیا۔ صرف دو منٹ برسا۔ ایسے جیسے اپنے پیچھے آنے والے سیاہ بادلوں کے لیے زمین پر چھڑکاؤ کر گیا ہو۔ اب سیاہ بادل بھی سر پر پہنچ گئے تھے۔ مشرق میں ببول اور شیشم کے درخت خشک ہوا میں مست ہو کر جھوم رہے تھے۔ اب پھیاں پھیاں مینہ برسنے لگا۔ ایکا ایکی مزید گہرے بادلوں کی ریل پیل ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تہہ در تہہ بادل دبیز ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ چھاجوں مینہ برسنے لگا۔ پرنالے چنگھاڑنے لگے۔ روشن دانوں پر ہر طرح جل ترنگ کے نغمے گونج اُٹھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر بچے اور لڑکے خوشی سے بھاگے پھرتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رعد کے کڑکنے کے ساتھ ہی بارش تیز ہو جاتی۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ پڑا ہے۔ سڑکوں پر جل تھل ہو گیا، بدرو شور مچاتے ہوئے رواں دواں تھے۔ کوئل کی دیوانہ وار کُو کُو عجیب منظر پیدا کر رہی تھی۔ کوے پناہ لیے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ ابابیل تیز بارش کے باوجود بادلوں کے پیچھے اُڑتے پھرتے تھے۔ ایسے جیسے بارش میں تیر رہے ہوں۔ یا بادلوں کے ٹکڑوں میں جان پڑ گئی ہو۔ اب تو بچے بھی نہا نہا کر تھک چکے تھے۔ لیکن بادل جوں کے توں مینہ برساتے رہے۔ پچھلے پہر بارش رُک گئی اور کبھی کبھی آفتاب بجلی کی طرح چمک جاتا اور پھر بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا۔ اب یقین سے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مزید بارش ہو گی۔

شام کے لیے لوگوں نے برسات کی موافقت سے مختلف کھانے پکانے شروع کر دیئے۔ کہیں سے پکوڑے تلنے سے سرسوں کے تیل کی جلنے کی بو آ رہی ہے۔ کہیں سلونی چیزیں پک رہی ہیں۔ اہل ثروت مرغ ذبح کروا کر لا رہے ہیں۔ ادھر گلیوں میں چیزیں بیچنے والوں کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ کوئی نمکین اور کھٹے چنوں کی آوازیں لگا رہا ہے۔ خوانچے والے بھی پہنچ گئے۔ یہ جامن "کالے بھورے" لے لو کی صدائیں دے رہے ہیں۔ ادھر امرود والے نے پکارا۔ ادھر آم بیچنے والے نے سریلی تان میں ایک ہی سانس میں کہنا شروع کر دیا۔ لے لو سردا کھالو گولڑا، شان والا سیندوریا، لنگڑا چکھ کے دیکھو، دسہری جنت کا میوہ کھا کے دیکھو تو یاد رکھو۔ بڑے بڑے بنگلوں میں بارش کے تھمتے ہی مختلف النوع لباس پہنے عورتیں گھومنے لگیں۔ گلناری، جوگیا، ملاگیری جوڑے دھانی چوڑیاں پہنے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ٹھنڈے موسم سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔

اب رات چھانے لگی پھر سے نئے بادل آسمان پر بھاگنے لگے جیسے شب خون مارنے والے چپکے چپکے بھاگ دوڑ میں مصروف ہوں۔ کبھی کبھی تاروں کے جگنو ذرا کی ذرا نظر آ جاتے۔ اب تو گرجتے ہوئے بادلوں کا نیا قافلہ آن پہنچا۔ موٹے موٹے قطروں نے کوٹھوں کوٹھوں پر دھماکہ چوکڑی مچا دی۔ ایسے جیسے اولے گر رہے ہوں۔ دن کو وہ چہرے جو برسات کی آمد پر کھلے ہوئے تھے۔ اب ان چہروں پر تفکر و خوف کی ہلکی سی کیفیت طاری تھی۔ غریبوں

کا حال تو بُرا تھا۔ کیونکہ ایسی قیامت خیز بارش پہلے بہت کم دیکھنے میں آئی تھی وہ امرا جنہوں نے شام کو آمد برسات پر مختلف قسم کے کھانے پلاؤ، مچھلی، پرسندے، بورانی، سمتی، شامی کباب اور مرغ پر اپنے لب ودہن کو نوازا تھا۔ اب وہ بھی اپنے اپنے بستر پر سراسیمہ بیٹھے تھے کیونکہ یہ فطری امر ہے کہ امراء غریبوں سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ جن کی امیدوں کے سلسلے دراز ہوتے ہیں۔ ان کے کان ہر خطرہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا خدا کر کے رات گزری اور صبح سویرے بارش تھم چکی تھی۔ ہر طرف جل تھل کے ساتھ ایک عجیب قسم کی بہار پھیلی ہوئی تھی کیونکہ موسم بہار کے مقابلے میں موسم برسات اپنی رعنائیوں میں اس سے کم نہیں۔

موسم بہار بھی اپنے ہمراہ گل وگلزار لاتا ہے اور موسم برسات میں مردہ بیج بھی نشو ونما پانے لگتے ہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار میں باغات کا جو سماں نظروں کے سامنے آتا ہے۔ وہ جنت کے نظاروں سے کم نہیں۔

مختلف طبقوں پر موسم برسات کے مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ چھوٹے موٹے دکانداروں کی آمدن میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ البتہ گوشت اور سبزی فروشوں کی دکانیں چمک اٹھتی ہیں۔ زمینداروں کے ہاں تو برسات کے قطرے دولت سمیٹ کے لاتے ہیں۔ ان کے مویشیوں کے لیے بغیر محنت کے شاملاٹوں اور کھیتوں میں گھاس پیدا ہونے لگتی ہے۔ کئی ملازمین موسم برسات سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے محکمہ سے چھٹی لے لیتے ہیں تاکہ انہیں گھر سے کوئی اس قسم کا خط موصول نہ ہو۔

آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہیں مانے تو چھٹی لے کے آجا بالما

عشاق کے لیے یہ موسم برسات خاص اہمیت رکھتا ہے۔ موسم بہار کی طرح ان کی دیوانگی انتہائی رومانی ہو کر فرزانگی میں بدل جاتی ہے اور وہ بھی بھیگے موسم کے مزے اٹھانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں وصل کے مواقع کے حصول پر خرچ کر دیتے ہیں۔

رند بھی اس موسم کے لیے سارا سال منتظر رہے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں اگر بارش کے لفظ کو اُلٹ دیں تو شراب ہے۔ فارسی شعراء نے تو شباب و کباب، شراب اور برسات کے اتصال کو جوانی کے لیے عہد قیامت کہا ہے۔ بھیگے موسم میں اگر انہیں مستی نصیب ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ایک سرمدی سرور حاصل کر رہے ہیں۔ غالب نے تو کہا تھا کہ اگر زندگی "اندوہ گیں" ہے تو شراب "اندوہ ربا" ہے۔

شعراء بھی اس موسم میں اپنے ذہن کو شعریت کے لیے زیادہ رسیا پاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ موسم برسات میں "آورد" ایسے غائب ہوتی ہے جیسے ماہِ رمضان میں ابلیس غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے "آمد" جگہ لے لیتی ہے۔

لیکن بسا اوقات موسم برسات کی ابر رحمت، ابر زحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دیہات اور شہروں کے کچے مکان اس کی نذر ہو جاتے ہیں۔ نیچی جگہوں پر پانی رُک جاتا ہے جو مچھروں کے لیے "چھاؤنی" کا کام دیتا ہے اور ملیریا کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ ندیاں، نالے اور بعض دریا سیلاب لانے کا باعث بنتے ہیں جو فصلوں کو تباہ وبرباد کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات مواصلات کا نظام تباہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ ٹیلی فون کے رابطے، شہروں کے آپس میں رابطے کٹ جاتے ہیں۔ رسد اور دوسری ضروریات زندگی کی ترسیل رک جاتی ہے جس سے تاجر طبقہ فائدہ اٹھا کر ضروریات زندگی کی اشیا من مانی قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں۔ اگر قانون حرکت میں آجائے تو یہ ان چیزوں کو بازار سے ایسا غائب کرتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ!

سب سے زیادہ نقصان دیہات کو پہنچتا ہے کیونکہ ڈھور ڈنگر رکھنے کے لیے انہیں کوئی خشک خطہ زمین میسر نہیں آتا۔ ان کے ارد گرد جوہڑ بن جاتے ہیں۔ جن کے سبب سے دیہات میں داخل ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ کپاس کی فصل خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔ گو چاول کی فصل کی بن آتی ہے اور وہ خوب پھلتی پھولتی ہے۔ سیلابوں سے کروڑوں روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ بعض اوقات سیلاب کے پانی کو ڈیم میں بھی نہیں سنبھال سکتے۔ تاہم شکوہ سنج نہیں ہونا چاہیے کیونکہ دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کے فوائد کے ساتھ ساتھ نقصان بھی نہ ہوں۔ کیونکہ مثبت اور منفی ایک دوسرے کا وجود قائم کرتے ہیں۔

ب۔ میرا پسندیدہ شاعر:

i. سوانح، خاندانی پس منظر، ذاتی حالات زندگی

ii. شاعری، شاعرانہ خصوصیات

iii. اردو شاعری میں انفرادیت، وجوہات

iv. تصانیف، کتابیں، اہم شاعری

v. پسندیدگی کی وجہ

جواب: مضمون: میرا پسندیدہ شاعر:

شاعری خصوصاً اردو شاعری وہ باغ ہے جس میں رنگ برنگ پھول کھلتے اور اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ اردو شاعری کے باغ میں ہر رنگ اور ڈھنگ کے شاعر اور اشعار موجود ہیں ولی دکنی اردو کے باوا آدم ریختہ کے استاد میر تقی میر شہنشاہ غزل کے غم دوراں و غم جاناں کے حامل اشعار رفیع سودا قصیدے کے بادشاہ استاد ذوق خاقانی ہند محب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے میر حسن مثنوی کے باوا آدم ناممکن کو ممکن کر دکھانے والے نسیم لکھنوی لکھنو کی تہذیب و معاشرت کا حرف بحرف نقشہ کھینچنے والے حفیظ جالندھری فردوسی اسلام گیت و نظم نگار حسرت موہانی عشق مجازی کے رمز شناس، اختر شیرانی عاشق صادق غالب فلسفہ طراز داغ دہلوی معاملہ بندی کے نقاش، اکبر الہ آبادی طنز و مزاح کے پردے میں مصلح قوم، فانی بدایوانی مصور غم، نظیر اکبر آبادی عوامی شاعر، جوش انقلاب انگیز جذبات جگانے والے مجید امجد منفرد و تنہا آواز، فیض تحریکی شاعر، میر انیس زبان دان، مرزا دبیر مرثیے کے دل و دوز اشعار کے خالق، حالی مسلم عروج و زوال نوحہ خواں ضمیر و محمد جعفری ہنسوڑ اور ہنسانے والے پژمردہ رگوں کو زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو عیاں اور نمایاں ہے۔ مگر نہیں اتنے سارے شعراء میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کے ہاں یہ ہر رنگ ایک نرالے روپ میں جلوہ گر ہے اور وہ ہے علامہ اقبال مفکر پاکستان، شاعر مشرق، حکیم الامت، مرد قلندر خود بین و خود آگاہ۔

علامہ اقبال کی شاعری پر سرسری نظر ڈالیں۔ غزل، مثنوی، نظم، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، قطعہ غرض اردو شاعری کی ہر ہیئت میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ہیئت کو چھوڑیں ان کا کلام اور تخیل معنوی و لفظی خوبیوں سے بھی مزین ہے۔ بلند اچھوتے خیالات، فلسفہ دین و سیاست، مذہب، تہذیب، معاشرت ان کا کلام میں موجود ہے۔ ان کے فلسفے کا ایک محور و مرکز ہے۔ یعنی خودی جس کے گرد عشق، موت، زمان و مکان، حرکت و عمل، فقر، مرد مومن غرض سبھی فلسفے چکر کاٹتے ہیں اور انسان کو انسانیت کے بلند مرتبے تک پہنچنے کا درس دینے کا ساتھ ساتھ منزل تک پہنچنے کی راہ بھی دکھاتے ہیں۔ علامہ اقبال نہ صرف بطور شاعر ہی میری پسندیدہ شخصیت ہیں بلکہ بحیثیت انسان اور مسلمان بھی پسندیدہ ہستی ہیں۔ آپ 9 نومبر 1876 کو سیالکوٹ میں شیخ نور محمد جیسے متقی اور پرہیز گار شخص کے ہاں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن کشمیر تھا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق علامہ کی تربیت پہلے والدہ نے کی پھر تعلیم کے لیے محلّہ کی مسجد میں بھیجا گیا پھر مولوی میر حسن سے تربیت پائی اور سکاچ مشن ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا۔ عربی اور فارسی میں مہارت میر حسن جیسے استاد کی مرہون منت ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی مودب اور حاضر جواب طالب علم استادوں کے قدردان، والدین کے تابع فرمان اور بزرگوں کا ادب کرنے والے تھے۔

واپسی پر کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری اور وکالت کی اس کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی تحریک آزادی میں شامل ہوئے سیاست کے میدان خارزار میں قدم رکھا۔ ابتدائی کلام سے وطن پرستی اور قومی درد ظاہر ہے۔ پھر ملت اسلامیہ آپ کے پیش نظر رہی اور آخر میں پوری انسانیت سے مخاطب ہیں۔ آفاقی شاعر کی عزت افزائی کے طور پر انگریز حکومت نے سر کے خطاب سے نوازا مگر احترام استاد ان کے پیش نظر تھا۔ فرمایا میری تمام قابلیت و لیاقت میرے استاد اور رہبر کے سر ہے پس پہلے میر حسن کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا پھر علامہ نے سر کا خطاب قبول کیا۔

یہ ادب، احترام، مذہب سے لگاؤ سبھی ان کی گھریلو تربیت کا اثر تھا۔ جو ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے فلسفیانہ خیالات افکار میں اتنی یک جہتی شوکت و عظمت پائی جاتی ہے کہ ہم ان کے شاعرانہ کمالات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان کے افکار میں تنومندی اور دل پسندی کے جو عناصر ہیں وہ سب کے سب تو نہیں زیادہ تر ان کی شاعری ہی کے ممنون احسان ہیں۔ علامہ کی شاعری کے تین بڑے دور ہیں: پہلا دور وطنت دوسرا دور ہمہ وطنیت یا ملت اور تیسرا دور انسانیت کا دور ہے۔ شاعر وطن کے محدود دائرے سے نکل کر وسیع دنیا پر نظر ڈالتا ہے، ان منزل میں عالمگیر اخوتِ اسلامی کا مقام بھی آتا ہے اور پھر بنی نوع انسان سے مخاطب ہوتے ہیں یہ مقام ان کی شاعری کی آخری کڑی ہے۔ ہر دور اپنے اندر انسانی نفسیات کے دلکش بیان کو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلے دور میں جو زمانہ طالب علمی سے شروع ہوتا ہے داغ وامیر کا رنگ نمایاں ہے عشق مجازی کا خوبصورت اظہار ہے

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا ان میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھرم بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تیری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اس کے علاوہ اسی دور میں انگریزی شاعر ایمرسن، کاوپر، لانگ فیلو، ٹینی سن کے خیالات اردو میں نظم کیے۔ ابتدائی مشق ہے اس لیے الفاظ میں اردو میں اتنی وسعت نہ تھی کہ فلسفیانہ مضامین کو حسن وخوبی سے ادا کیا جاسکے اور دوسرا نہ کہ علامہ اپنا پیغام اپنی آواز افغانستان و ایران تک بھی پہنچانا چاہتے تھے پس اس دور میں آپ ملی شاعر کی حیثیت سے ابھرتے ہیں تمام خیالات اسی ایک مرکز پر جمع ہیں۔ غزلیں نظمیں عمیق خیالات کی حامل ہیں۔ فلسفہ غالب ہے جو مشرقی و مغربی فلسفہ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس دور کی شاعری عظیم الشان انقلاب کی آئینہ دار ہے۔ بڑی خصوصیت

اضطراب، جستجو اور تذبذب کے رنگ کا زائل ہونا ہے۔ یقین و پیغام کا رنگ نمایاں ہے۔ وطن پرستی نہیں بلکہ اسلامی اصولوں کی اشاعت ہے۔ یہ تبدیلی جو علامہ میں آئی وہ ان کی دور بینی کا نتیجہ تھی۔

علامہ مغربی تہذیب سے بھی نالاں نظر آتے ہیں۔ انہیں اس کی بربادی کا یقین ہے کہ انگلستان اور جرمن رہ کر گہری نظر سے اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں اسی لیے تو خبر دار کرتے ہیں:

ے تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی   جو شاخ نازک پہ آشیانہ بے گا ناپائیدار ہو گا۔

اسی دور میں ہمیں اقبال کے آئندہ نقوش کی جھلک ملتی ہے اور نصب العین کا پتہ بھی چلتا ہے پھر جب اقبال ہندوستان واپس آئے تو ان کی شاعری پُر زور اور شیریں الفاظ کا خزانہ ہے۔ فارسی الفاظ و تراکیب عام ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہو گئی ہے۔ زاویہ نگاہ آفاقی ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور محاسن شعری کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ غور و فکر کا رنگ ہے۔ اب ان کا موضوع حیات، خودی، خدا، فلسفہ خودی، فلسفہ بے خودی، عشق، فقر، عقل وغیرہ ہیں اور وہ شخص جو دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر رہنا چاہتا تھا اب اپنے یقین کی پوری قوت کے ساتھ پیغام دیتا ہے کہ:

ے تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا   خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

اب ان کے کلام میں خیالات میں بہت وسعت ہے۔ تخیل میں بلندی، جذبات میں شدت اور احساسات میں ذکاوت ہے۔ وہ شاعر کے مرتبہ سے بڑھ کر پیغامبر بن گئے ہیں ان کی نظمیں شمع و شاعر، خضر راہ ان کے رجحانات کی آئینہ دار ہیں کون سا ایسا مسلمان ہے جس کو ان نظموں کے اشعار یاد نہ ہوں ان کے کلام کی پسندیدگی ان کی زندگی میں ہی جب وہ اپنا کلام بھرے مجمعے میں سنایا کرتے تھے ظاہر ہے کہ لاکھوں کے مجمعے میں بالکل خاموشی ہوتی تھی اور نالہ تیم نظم سنائی گئی تو لاکھوں کا مجمع رو رہا تھا۔ جب لاکھوں انسان ان کے کلام کے شیدا تھے تو مجھے کیوں نہ ان کے اشعار پسند ہوں۔ ایک نقاد نے ان کی نظم خضر راہ کے بارے میں لکھا کہ اس میں وہ آتش فشاں ہے جو اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور جس کا نام اقبال ہے۔ ان کا مسلک عشق ہے اور شاعری اس مسلک کی آئینہ دار۔

ے یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم   جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آپ سرمایہ داری کے خلاف ہیں اس کی مذمت اپنے اشعار میں بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں:

ے جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی   اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

بلاغت، مضمون آفرینی، مرز و ایماء، تغزل، رفعت تخیل کے علاوہ اسلوب بیان دلکش ہے شعر میں جاذبیت ہے

ے نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا   یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

زندگی کے حقائق و معارف ہیں جو انسان کو زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھاتے ہیں:

ے اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی   جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

جدت طرازی ہے۔ اچھوتا انداز پڑھنے والے پر کیف کا عالم طاری کرتا ہے اور یہ سب ان کی زبان دانی کی معراج ہے کہ وہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تلمیحات اور دیگر شعری محاسن سے اپنے کلام میں موسیقیت حسنِ ادا، ظرافت، دلکشی جیسی خوبیاں پیدا کر کے اپنی بلندیِ فکر کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں اور سننے والوں میں بھی نئی روح دوڑ جاتی ہے:

ے عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں   نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اگرچہ علامہ اقبال پیغام گو شاعر، مصلح قوم ہیں مگر ان کے ہاں شاعری کے تمام لوازمات، ان کی شاعری کو نصیحت نہیں بننے دیتے بلکہ وہ خوبصورت انداز میں درسِ عمل اور دعوت فکر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کا کلام اردو ادب کا بیش بہا تحفہ ہے۔ جس نے نہ صرف اردو شاعری کے مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونکی بلکہ اپنے قاری کے لیے بھی لذت بے تابی، ذوقِ طلب اور دعوتِ عمل، اس کے ظرف کے مطابق دی ہے، اسی لیے تو علامہ اقبال کا قاری اکتاتا نہیں بلکہ اپنے مزاج کے مطابق ان کے اشعار گنگناتا اور ان سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور زندگی کے میدان میں فکر و عمل کے ساتھ آگے بڑھنے کا جذبہ بھی اپنے اندر اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔

* * * * *